اسلام مغرب اور جدیدیت

ڈاکٹر نمارا سون کالج آف کامن ویلیم اینڈ میری کے شعبہ مذہبی امور میں سماجی علوم کی استاد ہیں

جدیدیت (modernity) ایک ایسا لفظ ہے، جس کا اصل مفہوم اس کی مختلف تعبیروں کی وجہ سے مبہم اور غیر واضح ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے ''اسلام اور جدیدیت'' کے موضوع پر ایک مکمل کتاب لکھی ہے لیکن اس اصطلاح کی تعریف اس کتاب میں نہیں کی گئی۔ عام طور پر ماڈرنٹی کو 'ماڈرنزم' کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جو ایک ملتی جلتی اصطلاح ہے مگر تیکنیکی طور پر اس کی تعریف مختلف ہے۔ مغرب میں جہاں یہ اصطلاح وضع کی گئی، ماڈرنزم سے مراد تیقن حاصل کرنے کا فلسفیانہ انداز ہے اور بنیادی طور پر اس کا انحصار وحی کی بجائے عقل پر ہے۔ اس اصطلاح کا آغاز ڈکارٹ کی ان کوششوں کی بنا پر ہوا جو اس نے بیّن اصولوں کو وضع کرنے اور شک وشبہ کی کیفیت پر غلبہ پانے کے لئے کیں تاہم اس اصطلاح کو کانٹ کے اس تنقیدی جائزے سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ جو اس نے فلسفہ علم، اخلاقیات اور جمالیات کے بارے میں مرتب کیا۔ تیقن کے بارے میں اس دانشمندانہ اور عاقلانہ رویے کو مغربی سائنس کی ترقی کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے یعنی وہ سائنسی انقلاب جسے عام طور پر زمانہ جدید کی پیداوار کہا جاتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اس پیش رفت اور یورپ کی سماجی وسیاسی تبدیلی کو، جو ایسے ہی مذہبی وسیاسی حاکمیت کے نظام سے جمہوریت کی طرف تبدیلی سے پیدا ہوئی، عام طور پر 'ماڈرنٹی' کی بنیادی خصوصیات تصور کیا جاتا ہے۔

تاہم روزمرہ کی زبان میں الفاظ 'modernity' اور 'modernism' اکثر ضم کر دیے جاتے ہیں۔ ٹیکنالوجی کے لحاظ سے ترقی یافتہ معاشرے کے عام تصور میں جدید یورپی معاشرے کی ثانوی سیاسی ترقی کے تصورات بھی شامل ہو گئے ہیں جیسے سیکولرزم اور جدید معاشرے کے بہت سے ذیلی پہلو جیسے مادہ پرستی (materialism) اور الحاد (atheism)۔ مغرب سے باہر سیکولرزم، مادہ پرستی اور الحاد جیسے جدید معاشرے کے تصورات کی منفی تعبیر کی جاتی ہے، خاص طور پر مسلم دنیا میں جہاں اس پر تنقید کرنے کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہ "جدید بنانے کا منصوبہ" ہے۔ مگر مغرب میں بھی ماڈرنٹی/ ماڈرنزم کا تنقیدی جائزہ بہت شدومد سے لیا جا رہا ہے اور مغرب میں جدید معاشرے کے کردار اور پیش قدمی کے بارے میں بھی واضح عدم اطمینان کی کیفیت موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ جدید معاشرے کے مسلمان اور مغربی ناقدین کافی معاملات پر ایک سی رائے رکھتے ہیں۔ تاہم بدقسمتی سے ہم ایک ایسے دور میں رہ رہے ہیں، جس میں مغربی حکومتوں اور مسلم دنیا کے کچھ حصوں کے درمیان سیاسی تصادم کی فضاء پائی جاتی ہے اور سیاسی کشمکش کو اکثر اوقات فکری عدم موافقت کہا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں باہمی غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں، جو مشترکہ اقدار کو دھندلا کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ مثال کے طور پر مسلم دنیا میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں، جو ٹیکنالوجی میں ترقی کی حمایت تو کرتے ہیں مگر وہ اقدار کے اس نظام کو رد کرتے ہیں، جس نے مغربی معاشرے کے ایک مخصوص تصور کو پوری دنیا میں صحیح یا غلط طور پر اتنا ناگوار بنا دیا ہے۔ لوگوں کی بڑی تعداد کی رائے ہے کہ جدید یورپی وامریکی معاشرے کے عقلیت پسندی (Rationalism) اور سیکولرزم کے تصورات میں ان ناگوار اقدار کا نظام پایا جاتا ہے۔ لہٰذا عقلیت پسندی (Rationalism) اور سیکولرزم کو اکثر غیر اسلامی یا اسلام مخالف خیال کیا جاتا ہے۔ ردعمل کے طور پر جب مغرب میں لوگ سنتے ہیں کہ مسلمان ریشنلزم اور سیکولرزم جیسے تصورات کو رد کرتے ہیں، تو ان کی سوچ یہ بن جاتی ہے کہ اسلام عقلیت پسندی کا مخالف ہے اور روایت پسندی، تھیوکریسی اور بنیاد پرستانہ طرز فکر کا حامی ہے۔

اس مضمون میں مذکورہ بالا غلط فہمیوں کی وضاحت کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ میں عقلیت پسندی، سیکولرزم اور ان پر کی جانے والی تنقیدی تحقیق کے بارے میں موجود غلط فہمی کے بارے میں بحث سے بات شروع کروں گی تاکہ اسلام اور مغرب کے درمیان پائی جانے والی مشترکہ اقدار کی نشاندہی کر سکوں۔ اس مقالے کا اختتام ٹیکنالوجی کی ترقی پر اپنے تبصرہ پر کروں گی اور یہی وہ شعبہ ہے جو جدیدیت اور ماڈرنزم پر تنقید کے حوالے سے علماء کی زیادہ توجہ کا مستحق ہے اور وہ اس حوالے سے ایک قابل قدر خدمت سرانجام دے سکتے ہیں۔

عقلیت پسندی

مغربی فلسفہ میں ریشنلزم کی بہت سی تعبیرات موجود ہیں۔ قدیم یونان میں حواس ظاہرہ کے ذریعے حاصل ہونے والے بظاہر غیر معتبر اور ناقابل پیشین گوئی نتائج سے گریز کی کوشش بھی ریشنلزم کی ایک تعبیر ہے۔ اس مقصد کو یقینی طور پر حاصل کرنے کے لیے

تجرباتی مشاہدات کی بجائے عقلی اصولوں پر انحصار کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے عمیق عقلیت پسندی کا آغاز دور جدید میں بھی دوبارہ اس وقت ہوا، جب تیقن کے اجزاء ترکیبی کی تلاش شروع ہوئی۔ اس زمانے تک حواس سے حاصل کردہ علم اور بھی زیادہ اس قابل نہیں تھا کہ اسے متعین شکل میں پیش کیا جاتا۔ مثال کے طور پر حواس کے ذریعے حاصل کردہ علم کی وجہ سے لوگ خیال کرنے لگے تھے کہ چاند روشنی کا منبع ہے اور یہ کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ یہ ایسے نظریات تھے جنہیں سائنسی ذرائع نے غلط ثابت کر دیا تھا۔ اس لئے چند مفکرین تمام علوم کی بنیاد حواس کے ذریعے حاصل شدہ معلومات سے گریز کر کے مستند ریاضیاتی اصولوں پر رکھنا چاہتے تھے۔

تاہم مغرب میں ''ریشنلزم'' اتنی بنیادی سطح کی چیز نہیں ہے۔ ''ریشنلزم'' کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ حواس کے ذریعے حاصل کردہ علم ہمیں ایسا مواد فراہم کرتا ہے، جس کی بنیاد پر عقل اپنی سرگرمی دکھاتی ہے اور ہمیں علم فراہم کرتی ہے۔ جدید عقلیت پسند فلسفیوں نے معتبر اقوال کو غیر معتبر یا مشکوک اقوال سے الگ کرنے کے لئے اقوال کی اقسام یا سچائی کے دعووں میں امتیاز قائم کیا۔ امانیول کانٹ، زمانہ جدید کے مشہور فلسفی نے مشاہدے سے اخذ ہونے والے اور اس کے نزدیک قبل از تجربہ سامنے آنے والے تصورات یا لوگوں کے عمومی انداز تفکر میں پائے جانے والے فرق کو واضح کیا۔ مثال کے طور پر وہ کہتا ہے کہ ہم خود کار انداز سے فطرت کی ان قابل مشاہدہ چیزوں کا ادراک کر لیتے ہیں، جو اتفاقی طور پر آپس میں منسلک ہوں۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ حرکت پہلے سے ٹھہرے ہوئے جسم میں توانائی کے داخل کرنے سے پیدا ہوتی ہے، اگرچہ ہم توانائی کے انتقال کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ ایسے تجربات کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ انہیں بالکل اسی طرح قابل انحصار سمجھا جا سکتا ہے، جس طرح تجزیاتی بیانات کو۔ تجزیاتی نتائج موضوع کی اس مخصوص تعریف سے اخذ کئے جاتے ہیں، جس سے ان کی تشکیل ہوئی ہو۔ مثال کے طور پر یہ نتیجہ کہ کوئی بھی چیز جس کی جسامت ہو، شکل رکھتی ہے۔ اس کے برعکس، ہمیں اپنے طور پر مربوط شدہ بیانات (Synthetic Statements) کے بارے میں زیادہ محتاط رہنا چاہئے جن میں دو ایسے اجزاء کو ملایا گیا ہو جو لازم نہیں کہ جوہری طور پر باہم متعلق ہوں۔

اسی طرح سے عقلیت پسندی محض رائے پر مبنی غیر یقینی صورت حال سے گریز کا اہتمام کرنا ہے۔ مگر دور جدید میں ریشنلزم نے اعلیٰ مذہبی طبقات کی طرف سے تعلیم دیئے جانے والے ناقص دلیل پر مبنی خیالات، مثلاً زمین کائنات کا مرکز ہے وغیرہ کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ ریشنلزم اس سیاست زدہ مذہبی نظام کار د عمل ہے، جس نے اپنا مرکزی کردار برقرار رکھنے کے لیے ان صداقتوں کو رد کیا، جو اس نظام کی طرف سے کبھی پیش نہیں کی گئیں۔ عقلیت پسند عام طور پر ایسے تیقن کی اساس کے متلاشی رہے، جس سے نوع انسانی بڑے معتبر انداز سے ان جابرانہ طاقتوں کے خلاف دلیل لا سکے، جو مذہب کو اپنا غلبہ برقرار رکھنے کے لیے استعمال کرتی رہیں۔ لہٰذا ریشنلزم کو مذہب کے خلاف، ملحدانہ اور اخلاقیات سے بالکل عاری سمجھا جاتا ہے۔ تاہم، مذہبی سچائی کو برطرف کرنا کبھی بھی ریشنلزم کا منشاء نہیں رہا، خاص طور پر اخلاقی تیقن جو کہ مذہبی سچائی سے حاصل ہوتا ہے، کبھی بھی ریشنلزم کے نشانے پر نہیں رہا۔ درحقیقت کانٹ کی بحث یہ ہے کہ نیکی اور فرض کے اساسی اخلاقی تصورات فطری (داخلی) ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اخلاقیات کے ابتدائی اصول عیاں بالذات ہیں۔ اس کا ''عقلی اخلاقیات'' کا پیش کیا گیا اصول قطعی طور پر توجہ کا طالب ہے کہ: ''صرف اس قول پر عمل کرو جو بیک وقت آفاقی قانون پر بھی پورا اترے۔'' دوسرے الفاظ میں صرف وہی کام کرو جو ان اصولوں پر منحصر ہوں، جن کے بارے میں آپ سمجھیں کہ ان پر ہر ایک کو عمل پیرا ہونا چاہیے۔ مزید برآں کانٹ کا خیال تھا کہ وجود خدا اور آخرت کے بارے میں علم کا تجرباتی طور پر اگرچہ مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا مگر خدا اور آخرت کو اخلاقیات کے مقاصد کے مکمل فہم کے لیے بطور اجزاء ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے۔

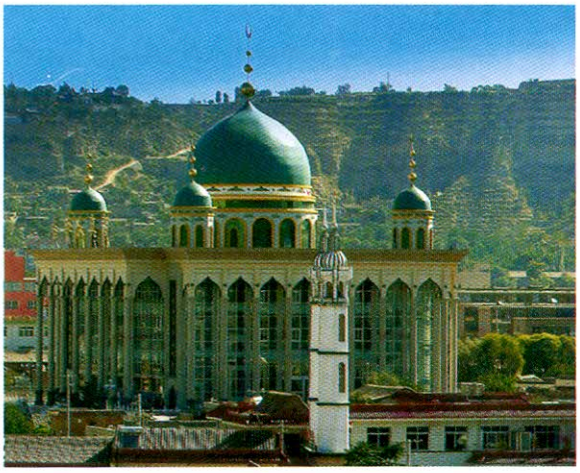

کانٹ خدا اور آخرت کے تصور کے بغیر اخلاقی دنیا کا تصور نہیں رکھتا مگر اس نے خدا اور آخرت کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ عقلیت پسند فلسفی ہوتے ہیں نہ کہ ماہرین مذہب۔ تاریخی سیاق وسباق کے تناظر میں عقلیت پسند خیال کرتے ہیں کہ ان کا کام یہ نہیں کہ وہ معلوم کریں کہ نیکی اور اخلاقیات انسانی فطرت میں مرکزی مقام کیوں رکھتے ہیں؟ یا خدا نے ہمیں اچھی فطرت پر پیدا کیا یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس بحث کو دوسروں کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ اسی طرح، اگرچہ جدید معاشرہ جس کے پاس ٹیکنالوجی ہے، اس کی بنیاد محتاط استدلال کے اثرات پر ہے، تاہم مغرب میں بھی اکثر لوگ خدا کے بغیر اخلاقی دنیا کا تصور قائم نہ کر سکے۔ لہٰذا ریشنلزم کا دفاع کرتے ہوئے، اہل مغرب کی اکثریت سوچتی ہے کہ استدلال اور وحی آپس میں متصادم نہیں۔ وحی کے اندر بہت سے پہلو ایسے ہیں جو ہم سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، مگر وحی کی اخلاقی تعلیمات عیاں بالذات ہیں۔ کوئی بھی آدمی جو معیاری ذہنی سطح کا حامل ہو، جس کی صاف انسانی فطرت کسی بے راہ روی یا ادویات وغیرہ سے خراب نہ ہوئی ہو، حقیقی اخلاقی تعلیمات کی اصابت کو تسلیم کرے گا۔ جس طرح قرآن پاک کی سورۃ ۴۱ میں ہے کہ ''انہیں چاہیے کہ وہ اپنی آنکھیں اور کان زمین کی سیاحت کرتے وقت'' یا ''آسمانوں میں اور اپنی

ذات میں نشانیاں دیکھتے وقت بروئے کار لائیں۔'' جدید ماہرین عمرانیات درحقیقت جدت کی بنیاد ایسے مذاہب میں تلاش کرتے ہیں، جن میں خدا کی وحدانیت کا تصور موجود ہے۔ ماہرین عمرانیات مثلاً پیٹر برگر وغیرہ خیال کرتے ہیں کہ خدا کی وحدانیت کا تصور قدیم پیگانزم (مظاہر فطرت کی پرستش) سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں خدا کو مکمل طور پر ماورائے ادراک اور خالق سمجھا جاتا ہے، کائنات سے باہر موجود ہے اور کائنات خدا کی محتاج ہے۔ تصور توحید کا خدا جو ایک ہے، افراد سے اخلاقی مطالبات بھی کرتا ہے۔ میکس ویبر کا کہنا ہے کہ اس کا نتیجہ فرد کی ذمہ داری کے تصور کی شکل میں نکلا اور یہی عقلیت پسندی کی بنیاد ہے لہٰذا دور جدید کی بنیاد بھی۔ اس کی نظر میں وحدانیت کے تصور سے سبق ملتا ہے کہ خدا نے انسانوں کو خاص صلاحیتیں ودیعت کیں اور ایک خاص مقصد دیا جس کی انہیں تکمیل کرنا ہے۔ خدا نے پھر ہمیں حکم دیا کہ ہم اس کی منشا کی پیروی کے لئے ان صلاحیتوں کو استعمال میں لائیں۔ ویبر سرمایہ داری نظام اور ترقی کی بنیاد (جو جدت کا باعث بنی) وحدانیت پر مبنی مذہبی تصور میں تلاش کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ خاص طور پر عیسائیت میں پروٹسٹنٹ فرقے نے قضاوقدر کے الہامی اعتقاد کی بنا پر لوگوں کو سخت محنت کے ذریعے مادی ترقی حاصل کرنے پر ابھارا تاکہ وہ ثابت کرسکیں کہ وہ خدا کے منتخب لوگ ہیں۔ واضح طور پر اس تصور کے مطابق جدت پسندی اور مذہب کے درمیان کوئی تصادم موجود نہیں، بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے باہم وابستہ دکھائی دیتے ہیں۔ فطری طور پر استدلال کی اہمیت کے اعتراف اور مذہبی اقدار کے درمیان کوئی کشمکش نہیں پائی جاتی۔ درحقیقت مغرب میں اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ استدلال کی اہمیت مذہب یا اخلاقیات کے سیاق وسباق میں ہوتی ہے۔ یعنی اس کی ضرورت تب ہوتی ہے، جب اسے صرف اخلاقی مقاصد کے لیے استعمال کیا جانا مطلوب ہو۔ جب اجتہاد کا ذکر ہو تو مغرب میں طلباء کا ردعمل تائید کرنے والا ہوتا ہے۔ بہت سے طلباء کلاس روم میں اسلام کے روایتی نظریات کے ساتھ آتے ہیں، جو انہوں نے ''مغربی سائنس'' کے مناظرانہ الزامات سے اخذ کیے ہوتے ہیں اور ان کا مطالبہ ہوتا ہے کہ مغربی سائنسی علوم کو 'اسلامی علم' سے بدل دیا جانا چاہیے۔ مغرب میں اسلام کے طالب علموں کا خدشہ ہوتا ہے کہ مسلمان استدلال کو رد کرتے ہیں اور اسے روایت کی اندھی تقلید کے ساتھ بدلنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ رائج الوقت غلط خیالات اس وقت رد کردیئے جاتے ہیں، جب وہ اسلامی تعلیمات میں علم کے حصول کے بارے میں انسانی ذمہ داری، خدا کی مرضی کو پورا کرنے کے لیے عقل کے استعمال، بدلتے ہوئے مخصوص حالات میں خدا کی منشاء کے نفاذ کے بہترین طریقوں کے بارے میں پڑھتے ہیں۔

بلاشبہ یقین تک پہنچنے کے لیے صرف استدلال پر انحصار کرنے میں خطرہ پوشیدہ ہے اور اسلام کا مطالعہ کرنے والے مغربی طلباء اس پر بحث کرنے کے لیے تیار ہیں۔ غلامی، نوآبادیاتی نظام اور نسل پرستی جیسی انتہائی ظالمانہ زیادتیوں کو بلاشبہ اخلاقی اصولوں کے خلاف گردانا جاتا ہے۔ درحقیقت یہی وجہ ہے کہ ایک انصاف پر مبنی معاشرے کے قیام کے لیے بطور بنیاد جدید رجحانات کے خلاف ردعمل کے طور پر ایک نظریے کا ظہور ہوا، جسے پس جدیدیت (Postmodernism) کہا گیا کیونکہ کانٹ کے مطابق ''خالص استدلال'' ایک منصفانہ معاشرے کے قیام کے لیے ناکافی ہے۔ مشہور اسکالر اڈورڈ سعید سے جب جدیدیت کے حوالے سے ان کے تنقیدی مضمون کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا'' میرا خیال ہے کہ مجھے جو بات اکثر متاثر کرتی ہے وہ ناانصافی پر غصہ کرنا، ظلم کی عدم برداشت، آزادی اور علم کے بارے میں بہت ہی غیر حقیقی خیالات ہیں''۔ لہٰذا بیسویں صدی کے آخر میں اٹھنے والی تحریک جسے post modernism کہا جاتا ہے ماورا ادراک یا آفاقی اقدار کو رد نہیں کرتی (جیسا کہ عموماً کہا جاتا ہے)، بلکہ عاقلانہ نتائج میں سے اخلاقیات کے اخراج پر تشویش کا اظہار کرتی ہے۔ مغرب میں بہت سے اسکالر عقلی تیقن اور اخلاقی تیقن کے درمیان فرق کو تسلیم کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ طلباء علامہ محمد اقبال استدلال کے کام، خاص طور پر ان کے تصور ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' Reconstruction of Religious Thought in Islam کو بہت سراہتے ہیں۔ عقلی تیقن صرف استدلال سے ہی جنم لیتا ہے۔ جب کہ اخلاقی تیقن داخلی ایمان پر منحصر ہے جو عقل کی پہنچ سے دور ہے۔ مگر پھر بھی استدلال بطور سرگرمی کی بنیاد کو رد نہیں کیا جاسکتا نہ ہی اخلاقی تیقن عقلیت پسندی کی جگہ لے سکتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں یعنی نہ ہی عقیدہ عقل کے بغیر کسی کام کا ہے اور نہ ہی عقل عقیدے کے بغیر کسی اہمیت کی حامل ہے۔

> جب مغرب میں لوگ سنتے ہیں کہ مسلمان ریشنلزم اور سیکولرزم جیسے تصورات کو رد کرتے ہیں تو ان کی سوچ یہ بن جاتی ہے کہ اسلام عقلیت پسندی کا مخالف ہے اور روایت پسندی، تھیوکریسی اور بنیاد پرستانہ طرز فکر کا حامی ہے۔

سیکولرزم

معاصر اسلامی مباحث میں سیکولرزم کو عقلیت پسندی (Rationalism) کی نسبت زیادہ برا سمجھا جاتا ہے۔ عام طور پر اسے ایک آڈیالوجی یا نظریہ سمجھا جاتا ہے اور اس کی تعبیر ایسے کی جاتی ہے کہ جیسے یہ کوئی بہت ہی ناپسندیدہ چیز ہو۔ عبدالوہاب المسیری اپنے ایک مضمون ''سیکولرزم کے جامع اور مفصل اصول وضوابط'' میں سیکولرزم کی معیاری تعریف ''چرچ اور ریاست کی علیحدگی'' کو رد کرتے ہیں مگر وہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تعریف شہرت حاصل کرچکی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سیکولرزم کی اگر پیچیدہ تعریف کی جائے تو یہ دنیا کے بارے میں ایک مجموعی نقطہ نظر، ایک خاص فلسفہ زندگی اور ایک ایسا جامع اصول ہے، جو حقیقت کی تمام سطحوں پر بہت سے مخفی اور صریح

طریقوں کے ذریعے عمل پیرا ہوتا ہے۔ یہ جدید مغربی تہذیب میں اساسی اور غالب اصول ہے اور اسی طرح تمام جدتوں میں کارفرما ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نتیجتاً سیکولرزم ایسا پیراڈائیم ہے جو کئی مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ اور وہ ان مسائل کو ''موجودہ تہذیب کا بحران'' کہتا ہے۔ وہ مسائل حسب ذیل ہیں:

''ترقی کا خمیازہ، مقدار، ہر شعبہ زندگی میں مشینوں کا تعارف، معیار بندی، حالت بیگانگی، مفہوم ومقصود کا بحران، افادی اقدار کا غلبہ، فلسفہ نسبیت (یہ نظریہ کہ علم/اخلاقیات اضافی چیز ہے اور زمان ومکان اور انفرادی تجربات پر منحصر ہے)، معاشرتی انتشار، دستور فراموشی، معاہدہ بندی کا بڑھتا ہوا رجحان، کسی تنظیم کے مفادات کا تحفظ بالمقابل تنظیم میں سول سوسائٹی کے مفادات کے تحفظ کا مسئلہ، ریاست کی فرد پر غیر ضروری پابندیاں، کمپنیوں اور بیوروکریسی کی بالادستی، ادارہ خاندان کا زوال، انحطاط شناخت، فرد کی پستی، انسان کو مرکز نہ بنانا، انسان دوستی کے خلاف فلسفوں کا ظہور، فلسفیانہ تشکیک، بین الاقوامیت یا عالمگیریت، انفرادی شناخت اور خلوت کا خاتمہ، دنیا پر امریکی غلبہ، غیر ممالک کی ثقافت، تجارت اور اقدار پر امریکی کنٹرول، جدید ٹیکنالوجی اور روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کی بھرمار، تصور کی تجسیم، اشیاء پرستی، ترقی سے بے جا عقیدت، تبدیلی اور فیشن کا رجحان، کنزیومرزم، فوری تسکین حاصل کرنے کا کلچر، خود فریفتگی کا کلچر، جدید دنیا بطور آہنی شکنجہ، خالق ومخلوق کے فنا کا نظریہ، دنیا سے اچاٹ پن، بے جا قومی امتیاز کا احساس، نسل پرستی، فحش نگاری، مفہوم کی تشکیل نو، سلب انسانیت، وغیرہ''۔

جناب المسیری سیکولرازم کو ملحدانہ نظام سے منسوب نہیں کرتے جبکہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن اسے الحاد کا خاصہ قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے سیکولرازم کے بارے میں صرف یہ کہا ہے کہ یہ ''جدیدیت کا زہر قاتل'' ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سیکولرازم تمام اخلاقی اقدار کے تقدس اور ہمہ گیریت (ماورائیت) کو پامال کرتا ہے اور یہ ایک ''لازماً ملحدانہ نظام'' ہے۔

اگرچہ فضل الرحمٰن میرے رہنما ہیں اور میں انہیں بہت ہی قابل احترام شخصیت سمجھتی ہوں لیکن اس بات کی نشاندہی ہونی چاہئے کہ سیکولرازم کے بارے میں یہ یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ملحدانہ نظام ہے اور میں نہایت ادب کے ساتھ جناب عبدالوہاب المسیری کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں کہ سیکولرازم کوئی نظریہ نہیں ہے۔ ہمارے لیے مناسب ہوگا کہ ہم جدید معاشرہ کے تمام مسائل کو سیکولرازم کے معیار پر پرکھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ سیکولرازم صرف ایک سماجی ڈھانچہ ہے جس نے مقدس رومن سلطنت کے ٹوٹنے کے ساتھ ہی جدید یورپ میں فروغ پایا۔

دو متضاد مسائل جن کا سیکولرازم حل چاہتا ہے، ان کا موازنہ کر کے سیکولرازم کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اولاً قرون وسطیٰ کے پادریوں کا حد سے زیادہ آخرت پر اصرار تھا جو اپنے پیروکاروں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے کہ وہ صرف آخرت کے بارے میں فکر کریں۔ انہیں دنیاوی امور کے بارے میں فکر کرنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ دنیاوی امور کو لالچ اور بدعنوانی کا دنگل سمجھا جاتا تھا۔ انہیں غربت اور اپنی تکالیف کے بارے میں شکایت کرنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ یہ چیزیں آخرت میں ان کے لیے اعزاز و اکرام کا باعث تصور کی جاتی تھیں۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ عام لوگوں کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی اس لیے کہ سیاست کرنا ان کے بس کی بات نہیں سمجھی جاتی تھی اور یہ تصور کیا جاتا تھا کہ اگر وہ سیاست میں حصہ لیں گے تو ان کی زندگی بلاشبہ آلودہ ہو جائے گی۔

سیکولرازم کے نام سے جو ایک نظام سب سے پہلے متعارف ہوا اس کا مآخذ لاطینی اصطلاح SAECULA ہے، جس کے معنی ہیں وقت کا اکھاڑہ یہ (aeterna) کے برعکس ایک اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں لامتناہی الہامی دنیا۔ یہ سیکولرزم ایک ایسی تحریک تھی جس کے ذریعے تمام اہل عقیدہ کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ اس دنیا کے بارے میں فکر کریں، تعلیم حاصل کریں، ظلم اور بدعنوانی کے خلاف جنگ کریں اور اپنی اور معاشرہ کی فلاح و بہبود کی ذمہ داری سنبھالیں۔ بعد میں سیکولرزم سے یہ مفہوم لیا جانے لگا کہ یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس کی رو سے کسی بھی مذہبی جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ دوسروں کی تعلیم کے بارے میں حکم چلائیں۔ صدیوں تک لوگوں کو جبری طور پر عقیدہ تبدیل کرنے کے دور کے بعد جب یہ عقیدہ غالب ہو گیا تو مذہبی تعلیم کو سرکاری سکولوں سے ختم کر دیا گیا۔ والدین کو یہ حق اور ذمہ داری دی گئی کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ ان کے بچے ان کے اپنے پسند کے مذہبی اصولوں کے مطابق تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

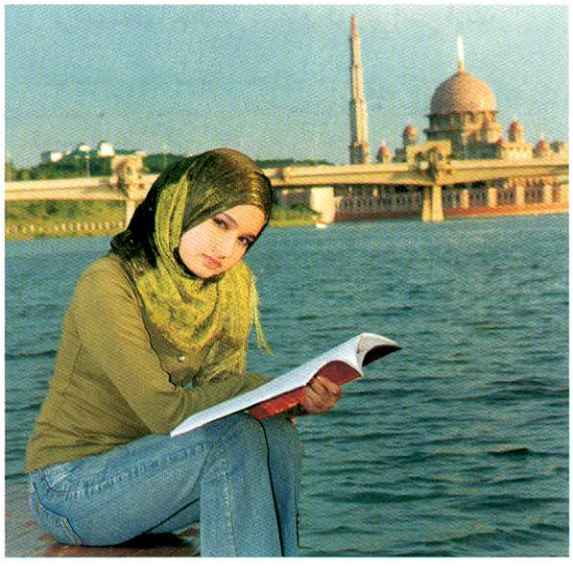

بلاشبہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ کوئی ماورائی اقدار نہیں ہیں اور در حقیقت کچھ ایسے ملحد لوگ بھی موجود ہیں جن کا عقیدہ سیکولرازم کے مفہوم سے مختلف ہے۔ سیکولرازم مذہبی اقدار کو رد نہیں کرتا بلکہ معاشرہ یا سیاست میں مذہبی اقدار کے کردار کو رد کرتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کا کوئی شخص مذہبی سکولوں کو بند کرنے کے لیے نہیں کہتا۔ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ مغرب میں مذہبی سکولوں کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ مزید برآں، اگرچہ کچھ لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ کلی

طور پر ماورائی اقدار سے رجوع کیے بغیر سیاسی فیصلے کر سکتے ہیں، عمومی طور پر ''اقدار سے بے نیازی'' (Value free) کی اصطلاح ایک افسانہ کے طور پر سامنے آئی ہے۔

علاوہ ازیں یہ بات واضح ہے کہ مذہب اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ معاشرہ میں الہامی اقدار پر عمل ہوگا، یہاں تک کہ سرکاری مذہب کی موجودگی میں بھی یہ ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ اس معاشرے میں الہامی اقدار پر عمل ہوگا۔ کلیسائی حاکمیت کے زیر اثر یورپ کی تاریخ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے، جیسا کہ رشید الغنوشی جو تیونس کے ایک مشہور و معروف مسلمان مفکر ہیں، انہوں نے اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ مذہبی و سیاسی نظام کے غالب ہونے اور اس کی مداخلت کے باعث سیکولرازم نے فروغ پایا۔ فی الحقیقت مختلف النوع بااختیار مذہبی سیاسی نظاموں میں سے ہر ایک نظام مذہبی اقلیتوں کے لیے امتیازی سلوک اور سخت گیری پر مبنی تھا۔ اس تناظر میں جدید یورپی اور امریکی دنیا میں امن کے لیے یہ لازمی ہو گیا تھا کہ ریاست کے جابرانہ اختیار سے مذہبی اختیار کو علیحدہ کیا جائے۔ جدید یورپی اور امریکی دنیا میں شہریت کسی مخصوص عقیدے سے وابستگی کی بنیاد پر مزید مبنی نہیں رہی تھی بلکہ شہریت کی اساس ایسے حقوق اور ذمہ داریاں تھیں، جو برادری کے ارکان کے مذہب سے قطع نظر ان کے درمیان تقسیم تھیں۔

معاصر اسلامی مباحث میں سیکولرزم کو عقلیت پسندی (Rationalism) کی نسبت زیادہ برا سمجھا جاتا ہے۔ عام طور پر اسے ایک آڈیالوجی یا نظریہ سمجھا جاتا ہے اور اس کی تعبیر ایسے کی جاتی ہے کہ جیسے یہ کوئی بہت ہی ناپسندیدہ چیز ہو۔

دوسرے لفظوں میں جابرانہ قوت اور مذہبی حاکمیت کی علیحدگی کثیر المذہبی معاشرہ میں امن قائم کرنے کا ذریعہ تھا۔ مختلف عقائد رکھنے والے لوگوں کو مذہبی آزادی دینے کا یہ ایک طریقہ تھا اور اس مذہبی آزادی کو قانونی تحفظ دیا گیا تھا تاکہ کوئی سرکاری مداخلت نہ ہو یا رکاوٹ نہ ڈالی جاسکے مگر اس میں اس بات کی شرط تھی کہ لوگ دوسروں کے حقوق کا احترام کریں گے۔ یہی وہ نظام ہے جسے مغرب کے زیادہ تر لوگ سیکولرزم سمجھتے ہیں۔ ہمیں سورۃ بقرہ (۲:۲۵۶) میں جو تعلیم دی گئی ہے، ان کے نزدیک بالکل یہی سیکولرزم ہے: ''مذہب میں کوئی جبر نہیں ہے''۔ علی ہذا القیاس، مغرب میں انتہائی مخلص مذہبی لوگ کٹر سیکولر ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہبی اقدار کے حقیقی مفہوم کو روز مرہ کے امور میں تلاش کیا جاسکتا ہے اور ان کی تعمیل کی جاسکتی ہے۔ مذہبی اقدار کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ آپ مہربانی سے پیش آئیں، وزن پورا تولیں، کاروباری معاملات میں ایمانداری کا مظاہرہ کریں، ضرورتمندوں کی مدد کریں اور ظلم کو روکیں۔ اگر ہاتھ سے نہیں روک سکتے تو زبان سے روکیں اور اگر یہ نہیں تو کم سے کم دل سے ظلم کو برا مانیں۔ یہ معروف حدیث کی عبارت ہے۔ تاہم یہ لوگ یہ نہیں چاہتے کہ ریاست مذہبی تعلیم کو چلائے۔ وہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ انہیں اپنے بچوں کو اپنی پسند کے مذہب کی تعلیم دینے کی اجازت ہونی چاہئے۔

اس طرح سے مجموعی طور پر سیکولرزم مذہب کو رد نہیں کرتا بلکہ یہ مذہب کی جابرانہ قوت کو رد کرتا ہے اور یہ بذات خود ایک اخلاقی قدر ہے اور یہ اخلاقی قدر کئی مذاہب کے اندر موجود ہے۔ اسلامی معاشرہ کی تاریخ اور ڈھانچہ یورپی عیسائی معاشرہ سے بہت مختلف ہے، تاہم یہ بات صحیح ہے کہ قدیم اسلامی سیاسی نظریہ جیسا کہ چوتھی صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی میں شافعی فقہ کے ماہر الماوردی نے بیان کیا ہے، کی رو سے مذہبی حاکمیت کو تنفیذی یا انتظامی طاقت سے الگ ہونا چاہئے۔ الماوردی کے نزدیک خلیفہ کا عہدہ اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ خلیفہ اسلام کے سپہ سالار اور دنیاوی امور کے منتظم کی حیثیت سے پیغمبرؐ کے کام کو جاری رکھ سکے۔ الماوردی کے مطابق خلیفہ کے فرائض میں تین چیزیں آتی ہیں: دفاع، خزانہ اور انتظام و انصرام۔ خلیفہ کو اپنے علاقہ کے شہریوں کو حملہ سے بچانا، سرحدی علاقہ کے دفاع کو قائم رکھنا اور ان لوگوں کے خلاف جنگ کرنا جو یا تو مسلمان بننے سے انکار کریں یا مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کرنے سے انکار کریں۔ بطور امین خلیفہ کا کام زکوٰۃ اور جائز مال غنیمت وصول کرنا، منصفانہ طور پر تنخواہیں مقرر کرنا اور خزانہ سے ان کی ادائیگی کرنا اور اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ جن لوگوں کا انہوں نے تقرر کیا ہے، وہ ایمانداری سے خزانے کی رقم کا استعمال کریں۔ مسلمہ مذہبی اصولوں کو تحفظ فراہم کرنا اور عدالتی فیصلوں اور سزاؤں کے نفاذ کو یقینی بنانا خلیفہ کی سب سے اہم ذمہ داریاں ہیں۔

الماوردی نے خلیفہ کی معیاری اہلیت میں یہ بات بھی شامل کی ہے کہ خلیفہ اجتہاد کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ لیکن انہوں نے یہ بات نہیں کہی کہ خلیفہ کا کام قانونی فیصلے بھی کرنا ہے، اس لیے کہ خلافت عباسیہ کے دور میں قانون سازی کا اختیار اعلیٰ تربیت یافتہ قانونی سکالرز (فقہاء) کو تفویض کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا قدیم نظریہ کی رو سے مذہبی سکالروں سے مشاورت کے سلسلے میں خلیفہ مقلد ہو سکتا ہے (قانونی نظیر پر عمل کرنے والا یا مقلد، نہ کہ ایک آزاد مفکر) اسلامی سیاسی نظریہ کا واضح اصول یہ ہے کہ اسلامی قانون سیاسی حاکمیت کے جواز کا حتمی مأخذ ہے۔ دوسرے الفاظ میں قانون سازی کا اختیار تکنیکی طور پر انتظامی اختیار سے الگ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں سیاسی (حاکمانہ یا جابرانہ) اختیار کو مذہبی (قانون سازی) کے اختیار سے الگ رکھا گیا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا گیا ہے، تاہم سیاسی اختیار نظریاتی طور پر اسلامی قانون کے تحت ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ مذہبی اختیارات سے جابرانہ اختیار کو نکال دیا گیا ہے، جیسا کہ مغرب میں ہوا لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ مذہب کو سیاست سے نکال دیا گیا ہے۔ مغرب میں بالکل اسی طرح کا طریقہ کار موجود ہے، جیسا کہ اسلام میں ہے یعنی کہ سیاسی اور انتظامی

اختیارات ملکی قانون کے پابند ہونے چاہئیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مغرب میں ملکی قانون کا انحصار تاریخی طور پر عیسائی قانون پر رہا ہے، تاہم مغربی قانون میں تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کو آزادی حاصل ہے اور یہاں تک کہ ان لوگوں کو بھی حقوق حاصل ہیں، جو کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس مغربی نظام قانون کا متبادل [اسلام میں] غیر مسلموں کے اس حق کے اسلامی تحفظ کی صورت میں موجود ہے جس کے تحت کسی اسلامی ریاست میں بھی غیر مسلم اپنے مذہبی قوانین پر عمل کر سکتے ہیں۔ یہ نظام واضح طور سے مغربی سیکولرازم سے مختلف ہے۔ جس طرح سیکولرازم مذہب کے خلاف نہیں ہے یا اپنی نوعیت کے اعتبار سے ملحدانہ نہیں ہے، اسی طرح اسلامی نظام بھی ملائیت پر مبنی نہیں ہے۔ حقیقت میں وہ عنصر جو سیکولرازم اور اسلام میں مشترک ہے وہ مذہبی آزادی کا احترام اور مذہبی جبر کی نفی ہے۔

ترقی

مغربی اور اسلامی دنیا دونوں میں بہت سے لوگوں کے ذہن میں ترقی کا مفہوم ٹیکنالوجی کے حوالے سے ترقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ مغرب میں جو کچھ ''فائدہ مند'' ہے اسے قبول کر لیا جائے اور باقی چیزوں کو رد کر دیا جائے۔ یہاں فائدہ مند چیزوں سے مراد ٹیکنالوجی کی ترقی ہے۔ بعض مسلمانوں کی رائے یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کو اپنانے کے ساتھ ساتھ روائتی اسلامی تعلیمات کو بھی ملحوظ رکھا جائے تا کہ ٹیکنالوجی کی ترقی کو اسلامی طریقے کے مطابق استعمال کیا جا سکے۔ یوں دلیل دی جاتی ہے کہ اس ترقی کو اچھے مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے اور مغرب کی طرح محض دولت اور طاقت حاصل نہ کی جائے۔

تاہم میں اسے بہت ہی بدقسمتی سمجھتی ہوں کہ ترقی کو ٹیکنالوجی سے منسوب کر لیا گیا ہے۔ میں اس بات پر یقین نہیں رکھتی کہ یہ رائے توحید پر مبنی کسی بھی مذہب کی اقدار کے مطابق ہے۔ یہ قابل فہم ہے کہ مغرب میں ''ترقی'' کو غیر معتذرانہ طور پر ٹیکنالوجی کی ترقی سے منسوب کیا جاتا ہے، جہاں جدید ٹیکنالوجی میں ترقی برپا ہوئی ہے (اگرچہ ٹیکنالوجی کے میدان میں حاصل کی گئی یہ ترقی سائنس اور ریاضی پر مبنی ہے اور ان مضامین کو مسلم دنیا میں فروغ حاصل ہوا اور یہاں سے یہ مضامین مغرب منتقل ہوئے۔) یہ وہ مقام ہے جہاں مسلم دنیا فی الحقیقت مغرب کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔

اسلام میں ''ترقی'' کے تصور کو کسی بھی صورت محض ٹیکنالوجی یا دولت کی پیداوار سے منسوب کر کے گھٹایا نہیں جا سکتا۔ دیگر روایات کے مقابلے میں اسلام کی واضح خصوصیت یہ ہے کہ اسلام میں انسانی ذمہ داری پر بہت زور دیا گیا ہے اور انسانی ذمہ داری یہ ہے کہ انسان انفرادی اور اجتماعی طور پر خدا کی مرضی کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالیں۔ یہ ذمہ داری ہمیں قانونی ڈھانچہ اور مذہبی فرائض کی ادائیگی میں نظر آتی ہے۔ قرآن اس ذمہ داری کو تاریخ میں جگہ دینے پر زور دیتا ہے اور یہ تاکید ماورائے زمان نہیں ہے۔ لوگوں کا عقیدہ، ذمہ داری اور الہامی ہدایت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہماری سماجی تاریخی تناظر میں نظر آنا چاہئے۔ اس کا آغاز امانت سے ہوتا ہے، جس کی ذمہ داری اٹھانے کا وعدہ بنی نوع انسان نے اپنی تخلیق کے وقت کیا۔ یہ وہ وعدہ تھا جس کے تحت ہم نے خلیفہ اور نائب کی حیثیت سے کردار ادا کرنا تھا تا کہ معاشرہ میں ایسی مساوات دوبارہ قائم کی جا سکے، جس طرح کہ بنی نوع انسان مساوی پیدا کیے گئے ہیں۔ راستہ (الشریعت)، راہ عمل (السبیل) دکھائے گئے ہیں۔ ''راہنمائی'' (ہدیٰ) قرآن کے ذریعے مسلسل فراہم کی گئی ہے، جسے ہر مرتبہ پڑھنے اور تلاوت کرنے سے رہنمائی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ یہ راہنمائی وہ معیار قائم کرتی ہے، جس کے ذریعے ہم راہ عمل میں اپنی ترقی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ ایسے معاشرہ کی مثال پیش کرتا ہے جو انصاف پر کاربند ہونے کے حوالے سے متحد ہو، ایک ایسا معاشرہ جس کی صحت کے معیار کا اندازہ اس معاشرے میں رہنے والے سب سے زیادہ کمزور افراد کی فلاح و بہبود سے لگایا جا سکے نہ کہ ریاست کی خام ملکی پیداوار (جی ڈی پی) یا اوسطاً فی کس آمدنی سے۔ اس راہنمائی کی موجودگی میں معیار کی حیثیت سے ٹیکنالوجی کی ترقی پر غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جس کے ذریعے ہم ترقی کا اندازہ لگاتے ہیں۔

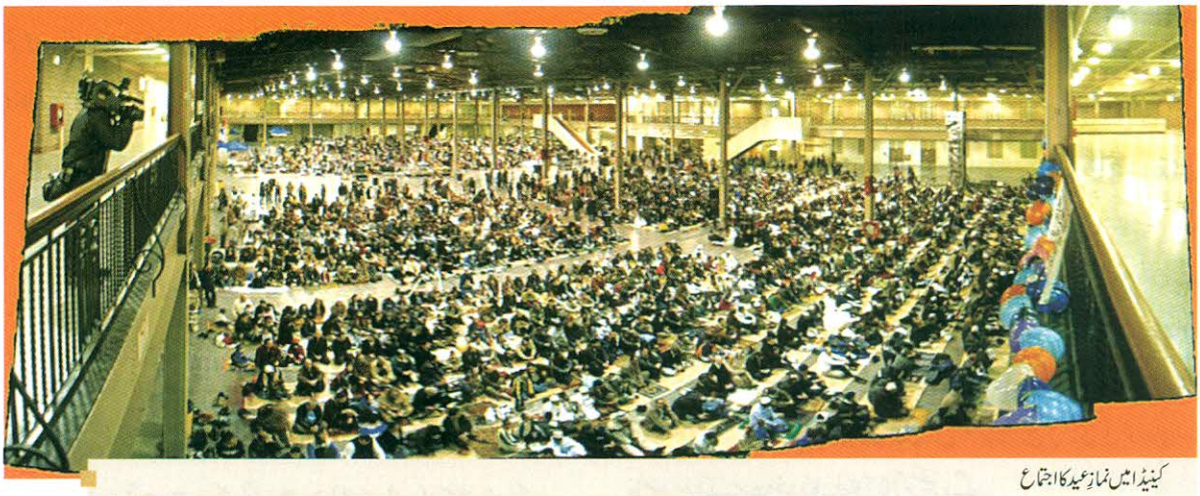

کینیڈا میں نمازِ عید کا اجتماع

انصاف کو فروغ دینے اور ظلم کے خاتمے میں کامیابی حاصل کرنے کے مقابلے میں ٹیکنالوجی کی بنیاد پر ترقی حاصل کرنے کو ترقی کا معیار قرار دینا محض شرک ہے۔

ترقی کے اسلامی تصور کی اہمیت سمجھنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح سے ''روحانیت'' اور ''سیکولر'' کے درمیان اس فرق کو ختم کیا جا سکتا ہے جو قرون وسطیٰ کی عیسائیت میں بہت نمایاں ہو گیا تھا۔ قرآن پاک میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ روحانیت اور سیکولرازم آپس میں کلی طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ سیکولر یعنی دنیا میں روزمرہ کے ہمارے باہمی عمل کے ذریعے ہی روحانی ترقی حاصل ہوتی ہے۔ فی الحقیقت، الہامی اقدار پر یقین یا ان کی پابندی کرنا یا ان کے سامنے تسلیم ہونے کا اندازہ لگانا کسی دوسرے طریقے سے ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے قرآن عمل سے خالی ایمان کی مثالیں بیان کرتا ہے، یعنی وہ لوگ جو ''دکھاوے کی عبادت کرتے ہیں اور یتیموں پر ظلم کرتے ہیں اور ضرورتمندوں کی بہبود کے لیے کام نہیں کرتے''۔ اسلام میں ترقی ایک ایسی صلاحیت کا نام ہے، جس سے انسان ہر قسم کے سماجی، تاریخی، معاشی اور سیاسی حالات میں ان اقدار سے صحیح طور پر وابستہ رہے بالخصوص ٹیکنالوجی کی ترقی کی ترغیبات اور چیلنجوں کو خاطر میں لائے بغیر ان اقدار سے وابستگی اسلام میں ترقی کہلاتی ہے۔ جب میں اپنے شاگردوں کو ان اصولوں یعنی ترقی کے اس نظریئے کی تعلیم دیتی ہوں، تو شمالی امریکہ میں موجود میرے شاگرد فوری طور پر اس تصور سے متاثر ہو جاتے ہیں، وہ اس بات میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں کہ قرآن پاک میں نماز کی ہدایت کے مقابلے میں کمزور اور مصیبت زدہ لوگوں کی فلاح و بہبود پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

> ''نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق و مغرب (کو قبلہ سمجھ کر ان) کی طرف منہ کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر اور فرشتوں پر اور (اللہ کی) کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں (کے چھڑانے) میں (خرچ کریں) اور نماز پڑھیں اور زکوۃ دیں اور جب عہد کریں تو اس کو پورا کریں اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہء) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ ہیں جو (ایمان میں) سچے ہیں اور یہی ہیں جو (اللہ سے) ڈرنے والے ہیں۔ (سورۃ البقرہ: ۱۷۷)

یہ طلبہ محسوس کرتے ہیں کہ ترقی کے حوالے سے اسلام کی یہ تعلیمات بالکل وہی ہیں، جو وہ چاہتے ہیں۔ فی الحقیقت بہت سے طلبہ نے یہ سمجھ لیا کہ یہاں قرآن پاک کا انداز بیان بہت واضح، براہ راست اور برمحل ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ مغربی دنیا میں موجودہ دور کی صورت حال سے متعلق نمایاں طور پر بے اطمینانی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مادی چیزوں، ان کے استعمال اور طاقت کے حصول پر بہت زور دیا جاتا ہے۔

اس صورت حال نے لوگوں کو روحانیت کی طرف مائل کر دیا ہے، جو اخلاقیات کے ذریعے مکمل ذہنی اطمینان حاصل کرنے کا منبع ہے۔ امریکہ کے کتب خانوں میں آج کل جو کتابیں سب سے زیادہ فروخت ہو رہی ہیں، وہ مذہبی موضوعات سے متعلق ہیں۔ اکثر لوگ یہ نہیں چاہتے کہ سرکاری مذاہب کو یورپ اور امریکہ میں نافذ کیا جائے۔ ہم مذہبی جبر کی اپنی باری گزار چکے ہیں اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ مذہبی جبر کے نتیجے میں کوئی اچھا اخلاقی معاشرہ پیدا نہیں ہو سکتا، نہ ہی مغرب کے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیں یا ٹیکنالوجی کے حوالے سے تنزل کی جانب جائیں۔ لیکن وہ یہ چاہتے ہیں کہ مقاصد بالکل واضح بیان ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ مقاصد کے واضح بیان کے حوالے سے مسلم دنیا جدید دنیا میں بہت بڑا کردار ادا کر سکتی ہے۔

> اسلام میں ''ترقی'' کے تصور کو کسی بھی صورت محض ٹیکنالوجی یا دولت کی پیداوار سے منسوب کر کے گھٹایا نہیں جا سکتا۔ دیگر روایات کے مقابلے میں اسلام کی واضح خصوصیت یہ ہے کہ اسلام میں انسانی ذمہ داری پر بہت زور دیا گیا ہے۔

مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی حد تک جدت پسندی/ جدید طور طریقے اپنانے کے سلسلے میں دفاعی رویہ اختیار کرنے کے بجائے مسلمانوں کو اب یہ موقع حاصل ہے کہ وہ مذہبی اور ذہنی آزادی قبول کرتے ہوئے اور ترقی کے اقدار کو فروغ دیتے ہوئے ترقی کے بارے میں اسلامی نظریات کا فیصلہ کن اور پراعتماد انداز میں اعلان کرنے کی صورت میں نہایت مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں تاہم اسلامی ترقی کی پیمائش مقدار کی بنیاد پر نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ ترقی کا ایک ایسا معیار ہے جس کی دنیا خواہشمند ہے، یہ ترقی کا ایسا تصور ہے جس کا اندازہ خوبی کی بنیاد پر لگایا جا سکے گا۔ اس ترقی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکے گا کہ ہم کس حد تک ایک منصفانہ سماجی نظام تخلیق کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ترقی کے مغربی تصورات کی اصلاح کرنے کے لیے یہ ایک ضروری عمل ہے۔ جب مغرب کے لوگ اس بات کو تسلیم کر لیں گے کہ مسلمان عقلیت پسندی کے خلاف نہیں ہیں اور ان کا نظام ملائیت پر مبنی نہیں ہے اور جب مسلمان یہ قبول کر لیں گے کہ مغرب کے لوگ مذہب کے خلاف نہیں ہیں اور ان کا نظام الحاد پر مبنی نہیں ہے، تو میرے خیال میں ہم ٹیکنالوجی کی ترقی کی خوبیوں اور خامیوں پر ایک بہت مفید مکالمے کا آغاز کر سکیں گے۔

ترجمہ: سید مراد علی شاہ، محمد اشرف طارق